# کیکٹس کے پھول

واحد بشیر

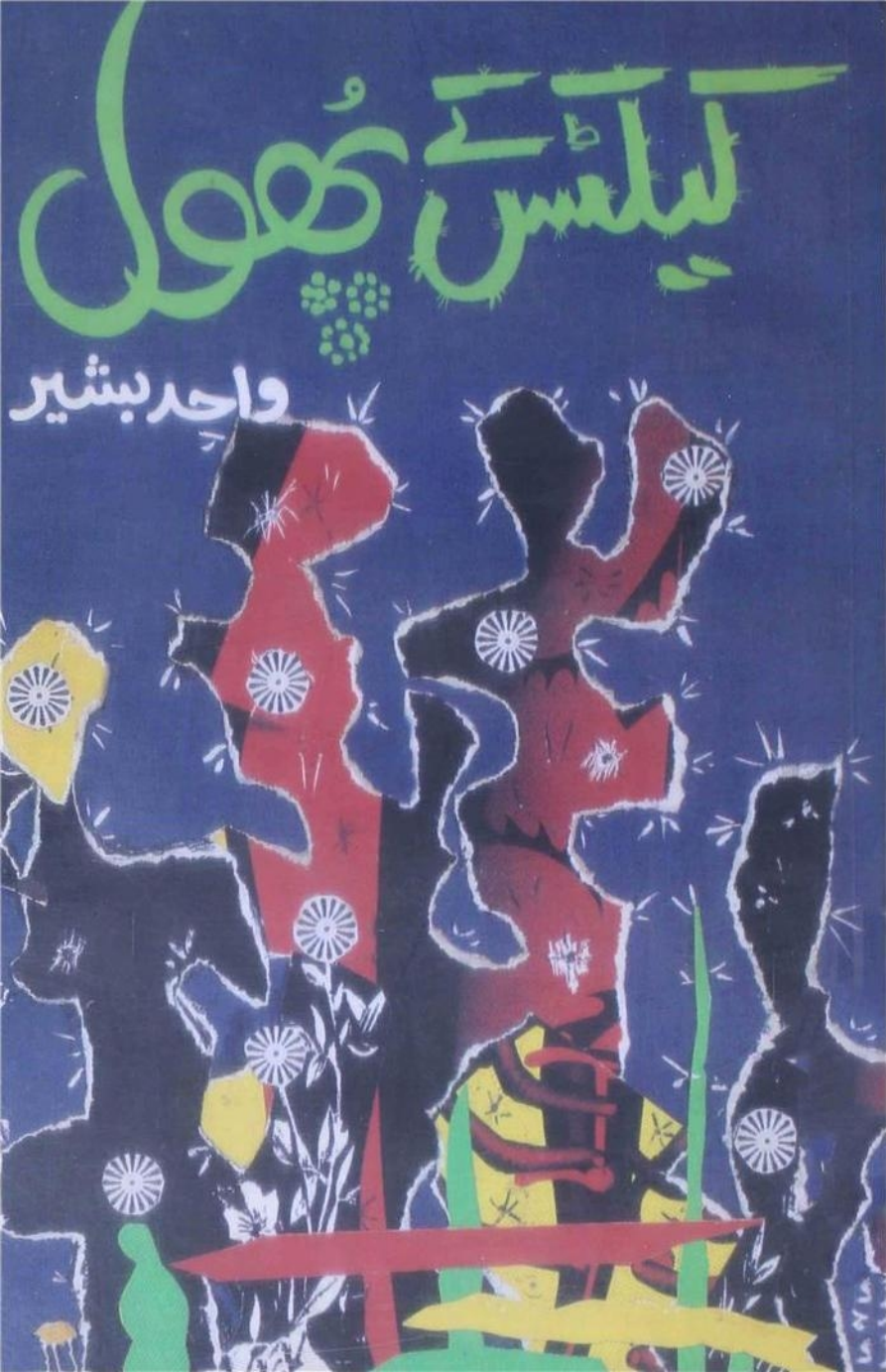

# کیکٹس کے پھول

واحد بشیر

یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ ہماری دنیا ابھی تک حاکم اور محکوم طبقات میں بٹی ہوئی ہے اور ان طبقات میں Generic مماثلتوں کے علاوہ اور وہ بھی حیاتیاتی (Biological) سطح پر، اور کوئی قدر مشترک نہیں ہے بلکہ میرا خیال یہ ہے۔ اور یہ خیال اگر غلط بھی ثابت ہوجائے تو میرے لیے بڑی حد تک درست ٹھہرتا رہے گا کہ حاکم اور محکوم طبقات کی نسبی ساخت ہی قدرے مختلف ہونی چاہیے۔ ان طبقات کے ذہن کا اسٹرکچر بھی قدرے مختلف ہوگا اور ان کی جینیاتی (Genetic) خصوصیات بھی مختلف ہونی چاہئیں۔ شاید اسی لیے ایک طبقے کے لوگ دوسرے طبقے پر گذرنے والی ابتلا کے نوعی فرق سے نابلد رہ پاتے ہیں۔ واحد بشیر کی شاعری ایک مخصوص نظام خیروشر کی قوت ادراک سے جنم لیتی ہے اور اگر اس شاعری کی اخلاقی اساس سے متفق ہوا جاسکے تو پھر واحد بشیر کے شعری احساسات اور ان احساسات کے لیے موزوں زبان کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مجھے واحد بشیر کی شاعری میں اس صدی کی نویں دہائی میں بھی نظر آنے والی طبقاتی خلیج (Cleavage) کی ڈرامائی اٹھل پتھل کارفرما نظر آتی ہے۔ وہ تمام حضرات جن کے خیال میں مشرقی یورپ میں سوشلزم کی حالیہ پسپائی اور اب عوامی جمہوریہ چین میں نئے سرمایہ دارانہ نظام کی آہستہ رو پیش رفت، سرمایہ دارانہ نظام کی اخلاقی برتری پر دال ہے۔ ایک افسوس ناک فکری مغالطے کا

سیم و زر ہیں بھینٹ کرتے اہلِ زر پاکر مراد
برہمن پیسوں کی خاطر بیچ کھاتا ہے صنم
اہلِ ثروت بھیک دیتے ہیں کہ پائیں کچھ ثواب
شیخ گیہ سکوں کی خاطر گروی رکھتا ہے حرم

اب بھی ہے اہلِ وفا کی تیرہ بختی اوج پر
آج بھی دیوارِ زنداں میں کوئی روزن نہیں
آج بھی گھیرے ہوئے ہیں بیکراں تاریکیاں
جز دلِ غم دیدہ کوئی اور دیا روشن نہیں

آج بھی غربت کدوں سے ہے گریزاں روشنی
آج بھی زندانِ غم میں پابجولاں ہے جنوں
جاگنے لگتا ہے اب بھی گر کوئی حساس دل
لوریں دے کر سلا دیتا ہے مذہب کا فسوں

مقتلِ انسانیت ہے آج بھی ہر سجدہ گاہ
آدمی زندانیِ اوہامِ باطل ہے ابھی
عقل کی راہوں میں حائل ہیں ابھی کہنہ رسوم
گم عقائد کے دھوئیں میں روئے منزل ہے ابھی

کل تلک جو دشمنوں کے دوست ہوتے تھے، ندیم
جعل سازی سے وہ بن بیٹھے ہیں میر کارواں
تشنگی کا ناری کا ان سے شکوہ ہی غلط
یہ تو وہ ہیں جو مٹا دیں زندگی کا ہر نشاں

اس سے بدتر حال ہوگا ظلم ہوگا اور بھی
جب تلک حاکم رہیں گے، رَب ڈالر کے غلام
موت سے بدتر رہے یوں زندگی کب تک بشیر
یا تو کرلو خودکشی تم، ورنہ ان کو دو لگام

(جون ۱۹۵۷ء)

# رفیقوں کی رہائی پر

مہر مستور سہی کوئی کرن تو پھوٹی
مرے ہم دم مرے محبوب جیالے ساتھی
دل میں ادراک کی اک شمع فروزاں لے کر
کنجِ زنداں کے اندھیروں سے گزر آئے ہیں

---

آؤ آدرش کی عظمت کو بناکر شاہد
آج پھر عہد کریں عہدِ وفائے تازہ

---

ظلمتِ یاس میں ہم پھر سے چراغاں کر کے
سرد جذبات میں شعلوں کی تپش بھر دیں گے
خارزاروں میں ہر اک گام کھلا کر غنچے
ارض کو آئینۂ عرش بریں کر دیں گے

---

# سکوت

(چیئرمین ماؤزے تنگ کی وفات پر ایک نظم)

رات بھر برف گرتی رہی
برف پاروں کی زد سے
شگفتہ گلوں کی جواں پتیاں
بکھری گئیں
پیڑ پتے دھلی چادریں اوڑھ کر
سرد کفنائی لاشوں کی مانند
جم سے گئے
پھوٹتی کونپلیں
اپنے اندر نمو کی حرارت لیے
ننھے بچوں کی مانند
تہہ بہ تہہ برف میں
چھپ گئیں

ستمبر ۱۹۷۶ء

# تیرے خوں کی قسم

تو فروزاں چراغ شب تار تھا
تو نگارِ سحر کا پرستار تھا
تو فراعینِ نو کا خطاکار تھا
تاک میں تیری ہر گرگ خونخوار تھا

سب ستم گر کہ ہیں خوں چشیدہ دہن
خونِ ناحق سے تر جن کے ہیں پیرہن
جن کے قبضے میں ہیں طوق و دار و رسن
چھین سکتے ہیں جو ہم سے تیرا بدن

وہ جو چنگیز و ہٹلر کے فرزند ہیں
بربریت میں ان سے بھی دوچند ہیں
جان لے کر تری گرچہ خرسند ہیں
پر حقیقت میں نادان وہ چند ہیں

اپنے آدرش پر دی ہے جب تو نے جاں
کیسے جائے گا تیرا لہو رائگاں

تیرے خوں کی قسم اے شہیدِ وفا
ہم بنائیں گے ہر موڑ پر قافلہ
سنگ ریزوں کو دیتے رہیں گے جلا
طے کریں گے شبِ غم کا ہر فاصلہ

ہم جلائیں گے شمعیں تری یاد کی
دل کے سازوں پہ چھیڑیں گے وہ راگنی
جس کی ہر تان دیتی رہے روشنی
ختم ہوجائے جس سے یہ تیرہ شبی

ہم کریں گے ادا یوں رفاقت کا حق
خوں بنے گا ترا صبحِ نو کی شفق

# شہید کی آواز

(چی گویرا کی وفات پر)

آج میں اپنے لہو میں ڈوبا
یوں سرِ قتل گہہ شوق کھڑا ہوں جیسے
اور بس چند ہی گھڑیوں کا یہاں مہماں ہوں
اور پھر دشتِ عدم کی ظلمت
اپنے دامن میں سمو لے گی مجھے
میرے قاتل نے یہی سوچا تھا
میرے قاتل تو یہی چاہتے ہیں
میرے قاتل تو یہی چاہیں گے

تم مگر اہلِ بصیرت ہو تمھیں علم ہے یہ
مجھ پہ جب وار ہوا
میں فقط میں تو نہ تھا
مجھ میں تجسیم تھی وہ روحِ بغاوت جس سے
اہلِ زر کانپتے ہیں
جس کے قدموں کی دبی آہٹ سے
ان کا خوں خشک ہوا کرتا ہے
یہ مرے جسم پہ پھیلا ہوا خوں
خونِ مردہ تو نہیں ہے کہ گرے اور مٹ جائے
اس کے ہر قطرے میں پوشیدہ توانائی ہے
اس میں اک موجِ نمو رقصاں ہے
اس کی خوشبو سے مہک اٹھیں گے صحرا، گلشن
اس کی حدت سے دمک اٹھے گا چہرہ چہرہ
تم کہ ہو اہلِ نظر جانتے ہو!
میرا خوں صرف مرا خون نہیں
یہ تو ہر عہد کا سرمایہ ہے
یہ ہے قرنوں کا ملال
یہ ہے جذبوں کا جمال
یہ تفکر کا جلال

یہ فقط خون نہیں ہے کہ فنا ہو جائے
یہ تو اک فکر ہے اک روح ہے اک جذبہ ہے
فکر و جذبات تشدد سے نکھر جاتے ہیں

آج میں اپنے لہو میں ڈوبا
گو سرِ قتل گہہ شوق کھڑا ہوں لیکن

موت میں تاب کہاں ہے مرے نزدیک آئے
میں تو زندہ ہوں سدا زندہ رہوں گا۔ میں تو
صرف اجسام بدل لیتا ہوں

## نذرِ لومبا

فضائیں کیوں سوگوار سی ہیں
ہوائیں کیوں بے قرار سی ہیں

یہ کون رخصت ہوا جہاں سے
کہ گونجتی ہے زمیں فغاں سے

یہ ملکوں ملکوں ہے کس کا ماتم
ہوئے ہیں کیوں سرنگوں یہ پرچم

یہ قریہ قریہ ہے شور کیسا
گلی گلی ہے یہ ذکر کس کا

شکار ہیں۔ سوشلزم کے کھاتے میں سوشلزم کی ناکامی کا حالیہ ڈراما یقینی طور پر عالمی سامراج کی کامیابی ہے لیکن اس کامیابی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جب اقتدار کی مسند پر فائز سوشلسٹ حکمران اپنے سسٹم کی غلطیوں کی اصلاح سرمایہ دارانہ طرز کی اصلاحات سے کرنے لگیں تو پھر دو متحارب نظاموں کی یکجائی ایک بڑے دھماکے کو جنم دیتی ہے جیسا کہ دیکھنے میں آیا اور اب مشرقی یورپی ممالک میں سوشلسٹوں کو رجعت پسند قوت قرار دینے والے اسی رجعت پسند قوت کے بتدریج ابھار سے اندازہ لگاسکتے ہیں کہ مختلف سیاسی مکاتب فکر کے لیے حسن اور خیر کے تصورات مختلف ہوتے ہیں۔

واحد بشیر کا اولین مجموعۂ کلام "کیکٹس کے پھول" صرف نظموں پر مشتمل ہے۔ یہ مجموعہ اُسی بین الاقوامی آدرش اور نظام اخلاق کا ترجمان ہے جو ہماری دنیا کے جملہ مسائل کا حل، استحصال سے پاک نظام کے قیام پر منحصر سمجھتا ہے۔ واحد بشیر سمجھتے ہیں کہ محبت جیسا فطری جذبہ بھی طبقاتی تصادم کی آلائشوں سے مبرا نہیں ہے۔

اس مجموعے میں شامل نظمیں خاص طور پر التجا، تحریک، اسم اعظم، آزادی، لمحۂ موجود، شہید کی آواز، فن کار، جرم و سزا، شب خون، امر راکھ، کیکٹس کے پھول، چاندنی، سکوت، عرض حال اور انتظار بلاشک و شبہ واحد بشیر کی شعری فکر کی ترجمانی کرتی ہیں۔

وہ شہر دہلی ہو یا مراکو
وہ ماسکو ہو کہ قاہرہ ہو

وہ شہر پیکنگ ہو یا کہ گھانا
وہ ارض مالی ہو یا ہو کیوبا

صدائے جمہور ہے یہ ہرجا
شہیدِ جہدِ بقا لو ممبا

ترے وطن کے وہی درندے
بکے ہوئے ہیں ضمیر جن کے

ترے گلے پر ہیں دانت انھیں کے
جو سانپ تھے تیری آستیں کے

یہ اتنے مہلک تو خود نہیں تھے
یہ زہر آیا تھا اور کہیں سے

خبر ہے سب کو کسے بتائیں
بکی ہیں اس کی کہاں دکانیں

چھپے ہیں کس سے لہو کے تاجر
یہ راز اب تو ہے راز ظاہر

کہ ساتھ آزادیوں کی دنیا
کے تاجروں نے کیا تھا سودا

فرانس و برطانیہ بھی ان کے
شریک تھے ساتھ تقسیم کے

کسی نے بو شو میں سوبوتو
کھنکتے ڈالر سمیٹنے کو

سوانگ اپنوں کا بھر کے آئے
وطن کی تقدیر بیچ کھائے

کرا کے نسلی فساد برپا
کیا انھوں نے وطن کو رسوا

اسی سہارے اسی بہانے
جہانِ آزاد کے خدا نے

کیا زمانے میں شور برپا
کہ خون بہتا ہے آدمی کا

پھر اس نے قوموں کی انجمن کو
کہا کہ جلدی سے فوج بھیجو

دکھائے پھر اس نے وہ تماشے
نہ دیکھے ہوں گے کبھی جہاں نے

اسیر کرنے کو تیرا لشکر
قدم قدم پر بچھائے جالر

چڑھا نہ دن تھا کہ رات آئی
گھنے اندھیروں کو سات لائی

اور ان اندھیروں میں سب سے چھپ کر
ستم کیے گو ہزار تجھ پر

مگر جھکائی نہ تو نے گردن
بہ صد شجاعت لٹایا تن من

تو آج گو تھک کے سو چکا ہے
سدا کو خاموش ہو چکا ہے

مگر اے مہر و وفا کے سورج
مگر اے صدق و صفا کے سورج

ترے مقاصد کی تاب ناکی
دلوں کو پہنچا رہی ہے گرمی

فضا میں کوندے لپک رہے ہیں
دلوں میں شعلے بھڑک رہے ہیں

ترے رفیقانِ راہ پھر سے
جلا رہے ہیں چراغ جاں کے

وہ دیکھ اٹھی ہے نگار فردا
لگائے تیرے لہو کا غازہ

ترے لہو کا ہر ایک قطرہ
اٹھا ہے بن بن کے اک بگولہ

جو ہاتھ تجھ پر کبھی اٹھا ہے
وہ آج ڈر سے لرز رہا ہے

وہ شومبے بھی ہے آج لرزاں
وہ بلجیئم بھی ہے آج ترساں

نظام کہنہ کے ہارے پاجی
چھپا رہے ہیں رخوں کی زردی

ہے موت تیری وہ تازیانہ
تڑپ اٹھا جس سے اک زمانہ

عوام دنیا کے جاگ اٹھے ہیں
مثال تجھ کو بنا رہے ہیں

یہ اب اسی وقت چین لیں گے
جب آگ دل کی بجھا چکیں گے

اے کانگو کے جواں دلاور
سلام تجھ پر سلام تجھ پر

(فروری ۱۹۶۱ء)

# پنگھٹ

جب سمٹتے ہیں شبِ تار کے تیرہ شہپر
اور گردوں پہ جھپکتی ہے ستاروں کی نظر
جب افق پر زرِ خورشید بکھر جاتا ہے
حسنِ فطرت کا نیا رنگ نظر آتا ہے
رقص کرتی ہے صبا آ کے ہر اک گل کے حضور
نغمۂ صبح سناتے ہیں بصد شوق طیور
دور پنگھٹ کی طرف سے جو ہوا آتی ہے
ساتھ چرخی کے تھرکنے کی صدا لاتی ہے
بسترِ خواب سے اٹھتی ہے ہر اک مستِ شباب
اپنی آنکھوں میں لیے مستیِ صد جامِ شراب
گوشۂ صحن سے گاگر کو اٹھا لیتی ہے
اپنی خوابیدہ سہیلی کو صدا دیتی ہے

جو نہ آئے تو بہ اصرار بلا لاتی ہے
اور اس شان سے پنگھٹ کی طرف جاتی ہے
جیسے تتلی کوئی خوش رنگ چمن میں گھومے
جیسے منہ بند کلی کوئی ہوا میں جھومے
دل کسی کا کسی آہٹ پہ دھڑک جاتا ہے
سر سے آنچل کسی چنچل کے سرک جاتا ہے
قصّۂ وصل کوئی شوخ جو دہراتی ہے
رخ پہ نوخیزوں کے سن سن کے حیا آتی ہے
کوئی مہجور جو آنکھوں کو جھکا لیتی ہے
گدگدا کر کوئی ہم عمر ہنسا دیتی ہے
چوڑیاں بانہوں کی جنبش سے کھنک جاتی ہیں
پائلیں پانو کے اٹھنے سے چھنک جاتی ہیں
لیجے پل بھر میں ہوئی حسن سے معمور فضا
قافلہ ماہ جبینوں کا جہاں آکے رکا
فکرِ شاعر بھی تحیر سے ہوئی مہر بہ لب
اندر نے جیسے سجائی ہو یہاں بزمِ طرب
یاں تو ہر لمحہ نیا چاند عیاں ہوتا ہے
چاہِ نخشب کا اسی جا پہ گماں ہوتا ہے

# گیت

بیت گئی آدھی رات
آئے نہ ساجن
چندا جن کی یاد دلائے
پائل جن کے گیت سنائے
من ہے جن کے سات
آئے نہ ساجن
بیت گئی آدھی رات
ٹیس اٹھے ہے رہ رہ من میں
کیا بتلاؤں بھولے پن میں
کھالی میں نے مات
آئے نہ ساجن
بیت گئی آدھی رات

پیت تو ہے اک روگ پرانا
جگ بَیری ہے من بے گانا
کس سے کہوں یہ بات
آئے نہ ساجن
بیت گئی آدھی رات

اگن برہ کی پھر بھڑکانے
لگی بدریا گھر گھر آنے
بَیری ہے برسات
آئے نہ ساجن
بیت گئی آدھی رات

(جنوری ۱۹۵۹ء)

آپ تصدیق کریں گے کہ ان نظموں میں ایک ایسی فکر کی کارفرمائی نظر آتی ہے جو ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے شاعر سے جدا نہیں ہوتی اور ہر ہر قدم پر اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہو پاتا ہے جب فکر و نظر اور ہئیت و مواد اس طرح شیر و شکر ہو جائیں کہ ان کے درمیان دوئی کا احساس ہی ختم ہو جائے۔

میرے خیال میں واحد بشیر نے اپنی نظم " انتظار " (1961) میں سوچنے والے ذہن کے جس کرب کو شعری زبان دی ہے وہ نیا نہیں ہے بلکہ ایک زندگی ہی پر کیا موقوف ہے یہ سوچنے والے ذہن کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔

اک آرزو کی کہکشاں
مدت سے ہے پیوستِ جاں

اک عمر سے ہے موجزن
احساس کا سیل رواں

لیکن حیات معنوی
ہے آج بھی دامن تہی

گرم سفر ہے قافلہ

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

زرد پتوں کے لیے ایک ہی جھونکا ہے بہت
نرم کونپل کی طرح پانو جمائے رکھیے

واحد بشیر

آتی نہیں آواز پا

کٹتے نہیں ہیں مرحلے
گھٹتے نہیں ہیں فاصلے ...

میں شاعر آشفتہ سر
باندھے ہوئے تار نظر

تکتا ہوں سوئے رہ گذر
بے چین سی اس آس پر

شاید کوئی صاحب نظر
لے آئے قندیل سحر

مندرجہ بالا سطور نظم کے مطالعے سے ظاہر ہوگا کہ واحد بشیر میں جہاں نظریاتی ایقان کی کارفرمائی ہے وہاں انہیں " منزل " سے " دوری " کا احساس بھی ہے اور اس کے لیے وہ اپنی کم کوشی اور کہنہ رسوم اور عقائد کی کارفرمائی کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ " عرض حال " کے دو بند ملاحظہ فرمائیے۔

مقتل انسانیت ہے آج بھی ہر سجدہ گاہ
آدمی زندانی اوہام باطل ہے ابھی
عقل کی راہوں میں حائل ہیں ابھی کہنہ رسوم
گم عقائد کے دھوئیں میں روئے منزل ہے ابھی

اس سے بدتر حال ہوگا ظلم ہوگا اور ابھی
جب تلک حاکم رہیں گے رب ڈالر کے غلام
موت سے بدتر رہے یوں زندگی کب تک بشیر
یا تو کرلو خودکشی تم، ورنہ ان کو دو لگام

مندرجہ بالا نظم کا سنہ تصنیف 1957ء ہے اور 1999ء میں شائع ہونے والے مجموعے میں شامل ہے۔ یہ اس وقت کی نظم ہے جب سوشلزم عروج پر تھا لیکن شاعر اس وقت بھی اپنے سماج کی صورت حال کو اپنے سماج کی جدوجہد کے آئینے میں دیکھنے کا عادی تھا۔ یہ جدوجہد ناکافی تھی اور آج تک ناکافی ہے۔

واحد بشیر کی شاعری کا قابل غور اختصاص یہ ہے کہ وہ کہیں بھی جذبے کے سیل میں بہتے نظر نہیں آتے۔ اسے اپنے نظریۂ حیات سے جس قدر پیار ہے اسی قدر انسانی زندگی سے بھی غیر مشروط طور پر پیار ہے۔ زندگی پر نظریے کے کامل انطباق سے جس قسم کے رویے جنم لیتے ہیں وہ واحد بشیر کی شاعری میں،

دوسرے ترقی پسند شعرا کی طرح موجود ہیں لیکن واحد بشیر اپنے ہم خیال شعراء کے مقابلے میں زیادہ حقیقت پسند ہیں۔

میں واحد بشیر کے اولین مجموعۂ کلام " کیکٹس کے پھول " کا اس توقع کے ساتھ خیر مقدم کرتا ہوں کہ یہ ترقی پسند شاعری کے دور حاضر کا ایک کامیاب شعری مجموعہ متصور ہوگا۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

# کیکٹس کے پھول

بند اسیری سے جب چھوٹا
اور گھر پہنچا۔
گھر کو ویسا ہی پایا
جیسا میں نے چھوڑا تھا۔
تبدیلی کچھ تھی تو یہ تھی
گھی کے خالی ڈبے میں بھری
مٹی میں اک پودا کھڑا تھا
ایسا پودا۔ جس کا تنا

آکٹوپس کے لچکیلے بازو کی طرح تھا
اور پتے
جھاڑو سے ٹوٹے ہوئے تنکوں کی طرح تھے
مجھ کو یہ بے ڈھنگا پودا
اچھا نہ لگا
بچے بھی اس پودے سے بے گانہ تھے
ہم نے سوچا اس بدہئیت پودے سے اپنی
جان چھڑا لیں
لیکن. بچوں کی ماں کی ضد تھی
یہ پودا گھر ہی میں رہے گا
اور اک دن اس میں پھول لگیں گے۔
تریاہٹ کے آگے ہماری کچھ نہ چلی
وہ پودا گھر ہی میں رہا
آکٹوپس کے بازو لانبے ہوتے گئے
اور پھر یوں ہی
چاروں موسم بیت گئے
پھول کوئی پھر بھی نہ کھلا
میں نے. بچوں کی ماں پر
جانے کتنے طنز کیے

اس نے ہنس کر
طنز و طعن کے وار سہے
پودے کو پانی دیتی رہی۔
جیسے اپنی بات پہ اس کو
پختہ یقیں تھا۔
جیسے اس پر
فطرت اور نمو کے سارے راز کھلے تھے
جیسے جیون دھارا میں
اس کے اپنے دودھ کی دھاریں شامل تھیں۔
یا پھر وہ
ماں ہونے کے ناطے
تولید کے وقت
اور اس سے پہلے
اندر اندر چپکے چپکے
ہونے والی ہر تبدیلی سے واقف تھی۔
وہ ماں تھی
وہ ماں تھی۔
اور اس کا یقیں ممتا کی طرح تھا

---

افکار و اشغال میں پھنس کر
میں اور بچے بھول گئے
کہ گھر میں کوئی کیکٹس کا پودا بھی تھا
لیکن وہ ممتا کی ماری
پودے کو پانی دیتی رہی۔
رات اور دن یونہی آتے جاتے رہے
تین اور موسم بیت گئے۔
چوتھا موسم
حسیں کونپلیں، خنک ہوا
اور ٹھنڈی بوندیں لے کر آیا۔
اس موسم میں
اک دن سورج نکل رہا تھا
بچوں کی ماں نے
خوشی بھری آواز میں یہ اعلان کیا
آؤ! دیکھو!
کیکٹس میں پھول کھلے ہیں۔
نیند سے بوجھل آنکھیں مل کر
میں نے دیکھا
اس بے ہنگم کیکٹس پر

پہلی اشاعت : جولائی ۱۹۹۹ء

مطبع : فضلی سنز-اردو بازار، کراچی-

کمپوزنگ : عامر شہزاد

تعداد : پانچ سو (۵۰۰)

ناشر : ارتقا مطبوعات

اے-۱۰، ولایت آباد نمبر ۲

کراچی-۷۵۷۰۰

قیمت ۱۰۰ روپے

چھتری جیسا حلقہ بنائے
دائرہ صورت صفیں جمائے
ہلکے گلابی پھول کھلے تھے
ہوا کی لَے پر ناچ رہے تھے
اور بچوں کی ماں کی آنکھیں
چمک رہی تھیں۔
میرے سارے طنز اور طعنے
مجھ پر واپس برس رہے تھے

# جلتے دن کا سپنا

میرے گھر
میری بستی میں
سناٹے کا گہرا جنگل
بڑھتے بڑھتے
صوت و صدا کے سب شیروں کو
نگل چکا ہے

اک گوریا
جلتے دن میں
چھانو میں چھپنے کے بجائے
تنکے کی تلوار اٹھائے
سناٹے کو کاٹ رہی ہے

## دوستو

دوستو آج شب
آؤ اک بار پھر
اس گلی میں چلیں
ہم گئے تھے جہاں
اپنے خوں خیز جذبوں کی مشعل لیے
رقص آہنگ قدموں پہ اڑتے ہوئے
اور ہار آئے تھے
اپنے جان و جگر

اپنا تن۔ اپنا من
وہ گلی۔ جس کی نسبت سے ہم کو پکارا گیا
وہ گلی۔ جس نے ہم کو بھلایا نہیں
وہ گلی۔ آج سنسان و ویران ہے
چشم بر راہ ہے
دوستو آج شب
آؤ اک بار پھر
اس گلی میں چلیں

# چاندنی

رات چاندی کا جال پھیلائے
مجھ کو آواز دے رہی ہے۔ سنو
مجھ سے کیوں اس قدر گریزاں ہو
میرے دامن میں وہ حسیں چہرہ
جس کو چھونے کی آرزو لے کر
تم نے شہروں کی خاک چھانی ہے
منتظر ہے کہ تم قریب آؤ

وقت کی تیز دھوپ نے تم سے

تازگی چھن گئی تو غم نہ کرو
میرے آنچل کی عطر بیز ہوا
اک نئی روح تم کو بخشے گی
جادوؤں نے تمہاری آنکھوں سے
نیند اگر چھین لی تو کیا پروا
میرے ہاتھوں میں ہے [illegible] کی ساز
جس کے نغمے ہیں جاں نواز بہت
میری آغوش کی خنک تابی
میرے ہونٹوں کا بولتا جادو
تم کو آرام سے سلادیں گے
دل سے ہر ایک غم بھلادیں گے

رات چاندی کا جال پھیلائے
مجھ کو آواز دے رہی ہے سنو
گھاؤ کے کھیت سینچنا چھوڑو
درد کی فصل کاٹنا چھوڑو
زندگی ایک بار ملتی ہے

ہاں مگر مل کی جاگتی چمنی

مجھ کو آواز دے کے کہتی ہے
چاندنی۔ رات ہی کا روپ تو ہے
صبحِ صادق کی روشنی تو نہیں
میرے سینے کی آگ کو دیکھو
جو کہ تخلیق کا ہے سرچشمہ
چاندنی سے کہیں مقدس ہے

# انتظار

اک آرزو کی کہکشاں
مدت سے ہے پیوستِ جاں

اک عمر سے ہے موجزن
احساس کا سیلِ رواں

لیکن حیاتِ معنوی
ہے آج بھی دامن تہی

زنجیر سے بوجھل قدم
ہونٹوں پہ مُہرِ خامشی

آرامِ جاں ہے چشمِ تر
وجہِ سکوں سوزِ جگر

پابند ہے ہر ہر نفس
سہمی ہوئی ہر اک نظر

مسموم ہے موجِ صبا
ہے سر پہ آویزاں عصا

ساری فضا پر چھائی ہے
لوہا کھنکنے کی صدا

گرمِ سفر ہے قافلہ
آتی نہیں آوازِ پا

کٹتے نہیں ہیں مرحلے
گھٹتے نہیں ہیں فاصلے

انس ہیں حدت نہیں
جذبات ہیں شدت نہیں

جینے کو جیتے ہیں مگر
جینے سے کچھ الفت نہیں

میں شاعرِ آشفتہ سر
باندھے ہوئے تارِ نظر

تکتا ہوں سوئے رہ گزر
بے چین سی اس آس پر

شاید کوئی صاحب نظر
لے آئے قندیلِ سحر

دکھلائے رہ کے پیچ و خم
منزل ہو پھر زیرِ قدم

(جون ۱۹۶۱ء)

کامریڈ حمزہ واحد کے نام

# دعوت

متاعِ ضبط کہ کل تک تھا جس پہ تجھ کو ناز
اُڑا کے لے گیا مجھ سے تمھارا اک انداز

نہیں ہو پاس مگر رات کی خموشی میں
میں سن رہا ہوں تمھاری وہ رس بھری آواز

بڑی اداس تھی کل تک یہ زندگی میری
ہوا ہے آج مسرت کا اس میں کچھ آغاز

ملا ہے آج مرے دل کو منزلوں کا نشاں
سمجھ رہا ہوں میں ان تیز دھڑکنوں کا راز

بڑھاؤ ہاتھ مری فکر کو سہارا دو
سخن میں آئے تمھاری نگاہ کا اعجاز

قدم ملاؤ مرے ساتھ جہدِ ہستی میں
دکھائیں تاکہ محبت کا اک نیا اعجاز

ہماری فکر و نظر میں رہے ہم آہنگی
سنائیں ایک ہی نغمہ ہمارے دل کے ساز

بصد خلوص عروسِ سحر کی نذر کریں
تمھاری زلف کی نکہت اور اپنے دل کا گداز

شرابِ شوق پئیں اور کیف و مستی میں
حیاتِ نو کے سفر میں کریں ہم پرواز

(۲۷ فروری ۱۹۶۲ء)

# خواب اثر

شب رنگ اُجالوں سے ضیا مانگنے والو!
پاؤ گے نہ کچھ اور بجز داغِ ندامت
اشکوں سے دُھلی ہے نہ دُھلے ظلمتِ حالات
آہوں سے رکی ہے نہ رکے گردشِ ایام
شکووں سے کبھی دستِ ستم رک نہیں سکتا
فریاد سے سیلابِ بلا تھم نہیں سکتا
تفہیم سے بنیادِ سَتم ڈھے نہیں سکتے

تحریر ہو تقریر ہو کافی نہیں دونوں
تحریر فقط معجزۂ رقصِ قلم ہے
تقریر فقط آئینۂ حُسنِ زباں ہے
جینا ہے تو ہر سانس کو اک تیشہ بنالو
ہر ذرّہ بے قدر سے خورشید تراشو

(جون ۱۹۶۴ء)

# تخت یا تختہ

ہم کہ واقف نہ تھے منزل و راہ سے
سادہ لوحی میں کہنے پہ اغیار کے
پشت بالپشت سے جو کہ تھے رابطے
بے جھجک یک قلم منقطع کر لیے
ہنس کے خونِ جگر نذر کرتے رہے
ہر خلاء اپنی لاشوں سے بھرتے رہے
چند انساں نما بھیڑیوں کے لیے
عیش و عشرت کے ساماں مہیا کیے

اپنے حصے میں آئی وہی تیرگی
بھوک، بیکاری و بے بسی مفلسی
کچھ مداری تماشے دکھاتے رہے
روز و شب خون ہم کو رلاتے رہے
روز راعی نئے روز فرماں نئے
روز وعدے نئے روز پیماں نئے
کیجے محرومیوں کا کہاں تک بیاں
جس کو دیکھو وہی ہم سے ہے بدگماں
راز اب جاکے ہم پر کھلا ہے کہیں
ہیں سبھی مطلبی کوئی اپنا نہیں
ظلم سہتے رہے خامشی سے اگر
یہ نہ سمجھو کہ مرنے سے کچھ تھا حذر
معرکہ اک نہ اک دن تو ہوگا یہاں
جیت جائیں گے یا ہار جائیں گے جاں

(فروری ۱۹۵۹ء)

# سوال

کچھ دیوانے
ہم میں سے ہیں
ہم جیسے ہیں
ہاں۔ لیکن یہ دیوانے ہیں
جن کے رخ پر فکر کا پرتو
ہاتھوں میں احساس کی مشعل
آنکھوں میں جذبوں کے الاؤ
دل میں گڑے دُشنام کے خنجر

پھر بھی لب پر گیت وفا کے
سولی پر بھی ہنستے گاتے
زندہ یوں ہیں
موت بھی ان سے شرمندہ ہے۔
یہ دیوانے
ہم جیسوں سے
یہ کہتے ہیں
یارو۔ اتنے چپ چپ کیوں ہو
اندیشوں کی سولی پر یوں
کیوں لٹکے ہو؟
جینے کی خواہش کو کچل کر
اس سولی پر لٹکے لٹکے
مرنا چاہو مر نہ سکو گے
لاؤ اپنا ہاتھ بڑھاؤ
ایک اور اک گیارہ ہوتے ہیں
عزم و یقیں سے قدم ملا کر
جب جب ہم آگے بڑھتے ہیں
ساگر کی لہروں کی طرح سے
ایک تسلسل بن جاتے ہیں

اور یہ تسلسل
جب طوفانی بن جاتا ہے
اندیشوں کی سولی ہی کیا
وہم و گماں کے سارے لشکر
بہہ جاتے ہیں۔
دیکھو! کیسے دیوانے ہیں
ہم جیسوں کو بہکاتے ہیں
لیکن یارو
کیا ممکن ہے
یہ دیوانے سچ کہتے ہوں؟

(اپریل ۱۹۷۶ء)

# شگون

دریا کے سوکھے پاٹ سے جب
دھول کے طوفاں اٹھنے لگیں
تو یہ سمجھو
کہساروں کی اونچائی پر
جمی برف کی تہیں
پگھلنے والی ہیں
سیلابوں کے موسم آنے والے ہیں

جب فصل کٹے

اور بھوکے کھیت کے پیٹ سے
مردہ جڑوں کا دھواں اٹھے
تو یہ جانو
آنے والی فصلیں
گزری فصلوں سے
بہتر ہوں گی

جب بچے کھوجی بن جائیں
اور جھوٹ کو سچ کہنے سے
انکار کریں
سچائی کے اظہار کو اپنا
حق منوانے پر اصرار کریں
تو یہ لکھ لو
ان کو وعدوں
اور کھلونوں سے بہلانا
ناممکن ہوگا

بیٹھے رہو تو دور بہت دور منزلیں
چلتے رہو تو آپ سمٹتے ہیں فاصلے

---

چشمِ تر کو رونے دو اس قدر کہ خوں برسے
مدتوں مرا دامن آنسوؤں کو ترسا ہے

# عزم

فکر کی مشعلیں جلائیں گے
ہم اندھیروں کو چیر جائیں گے

کھو گئی رہ گزر تو غم کیا ہے
ہم نئے راستے بنائیں گے

چھن گئے ہم سے گر زبان و قلم
ہم اشاروں میں گیت گائیں گے

صرف زنداں ہی میں نہیں موقوف
ہم صلیبوں پہ مسکرائیں گے

ٹھان لی ہے کہ جہدِ ہستی میں
زندگی داؤ پر لگائیں گے

بڑھ گئی تیرگی جو راہوں میں
خونِ دل سے دیے جلائیں گے

اب جو آئے تو صحنِ گلشن میں
ہم بہاروں کو ساتھ لائیں گے

# تحریک

لوگ کہتے ہیں کسی ماہ جبیں کو میں نے
نوجوانی کے سبک لمحوں میں
لازماً دل میں بسایا ہوگا
جاں سے بڑھ کر اُسے چاہا ہوگا
اور حالات کے بے رحم تھپیڑوں نے اسے
چھین کر مجھ سے
مری روح میں بھر دی ہوگی
زخمِ دوری کی اک آگ

آگ وہ! جس میں جلا کرتا ہے
رات دن ذہن مرا
اور میں قوت برداشت سے باہر پاکر
ہجر کی آگ کے یہ تیز لپکتے شعلے
کبھی نغموں کبھی نوحوں میں سمو دیتا ہوں
ورنہ گیتوں میں مرے سوز کہاں سے آیا؟
کس نے بخشا مرے نغموں کو فسونِ تاثیر؟
دین ہے کس کی مرے نوحوں کا یہ سوز و گداز؟
کس نے افکار پراگندہ کو دے کر اک ربط!
ان کو دے دی ہے زباں؟
کیسے سمجھاؤں انھیں!
کیسے بتلاؤں انھیں!
نوعِ انسان کی ہے ایک جماعت ایسی
زیست ہے جس کے لیے ایک عذاب
ہاں وہی زیست جو اوروں کے لیے
رنگ ہے، سن ہے اور نغمہ ہے
اس فلاکت زدہ مخلوق کا ہے مقصد زیست
پارہ نان جویں۔ بھوک مٹانے کے لیے
پارچہ۔ کوئی سی۔ جسم چھپانے کے لیے

اور یہ پارچہ و نانِ جویں
ایک بے رحم حسینہ کی طرح
دور سے جلوہ دکھا کر انھیں ترساتے ہیں
یہ جماعت ہے مری
کیسے سمجھاؤں انھیں!
حوصلہ، مجھ میں نہ تھا چاہ کا ارماں کرتا!
اتنی فرصت تھی کہاں ناز اٹھاتا پھرتا!
ہاں مرے ساتھ پلیں اور بڑھیں
لڑکیاں یوں تو کئی
جن میں تھیں بعض حسیں
اس سے پہلے کہ مجھے ہوتی کسی سے الفت
اس سے پہلے کہ نکھرتا کسی لڑکی کا شباب
اس سے پہلے کہ سمجھتیں وہ تقاضے دل کے
باپ کی جیب پہ بن جاتی تھیں اک بار گراں
اور وہ ڈھونڈنے لگتے تھے کوئی مرد کہ جو
زیست کا بوجھ اٹھانے میں ذرا ہاتھ بٹائے
نام پر شادی کے بیٹی کو اٹھا کر لے جائے
گھر میں اک فرد کی آجائے کمی
ایک روٹی تو بچے

اور اچھا ہو جو خوش حال کوئی مل جائے
کچھ سہارا ہی ملے
شکل کی،
عمر کی
کچھ قید نہیں
لڑکیاں تھیں جو حسیں۔ ان کے ملے دام اچھے
یعنی بر خوب ملے۔ باپ کے بھی بھاگ کھلے
میں نے دیکھا ہے یہی۔ دیکھتا رہتا ہوں یہی
کیسے سمجھاؤں انھیں!
دیکھتا رہتا ہوں میں شہر کے بازاروں میں
لڑکیاں ایسی حسیں
جن کو چھوتے ہوئے تھرائے نظر
(میرا بس ہو تو بجادوں انھیں شوکیسوں میں)
اجنبی دیس کی خوشبو میں بسی
سولہ سنگھار کیے
اپنے کچھ چاہنے والوں کو جلو میں لے کر
کچھ خریداری میں مصروف تو کچھ محوِ خرام
میں حسیں خوابوں کی دنیا میں چلا جاتا ہوں
میری گردن میں حسیں بانہیں اتر آتی ہیں

میرے شانے پہ بکھرتی ہوئی زلفوں کی مہک
تازہ کرتی ہے مشامِ جاں کو
میرے جذبات میں ہوتا ہے تلاطم برپا
اور لب جاگتے جذبات سے تھراتے ہیں
مجھ کو رہتا ہے فقط اک احساس
(ایک احساس کہ ہے جس کی سزا
باغِ فردوس سے آدم کا نکالا جانا
اور جو ہے جرم بروئے اخلاق)
جاگ اٹھتی ہے مری گرسنگیِ اعصاب
اور ہوس کے عفریت
میری آنکھوں میں سمٹ آتے ہیں
توڑ دیتی ہے کسی دخترِ تہذیب کی چشمِ نفرت
میرے خوابوں کا فسوں
سوچتا ہوں کہ مرا جسم بھی ہے کتنا ذلیل
جس کو آداب کا اخلاق کا کچھ پاس نہیں
عزتِ نفس کا احساس نہیں
پھر یہ آتا ہے خیال
یہ کشش اور یہ کھنچاؤ
جسمِ انسان کی فطرت کا تقاضہ ہی تو ہیں

کیا میں انسان نہیں؟
ذہن دیتا ہے جواب
ہو تو انسان مگر مفلس و قلاش ہو تم
تم ہو قرنوں سے غلام
بھوک کے، درد کے، افلاس کے

دیرینہ اسیر

اور ہیں سیم و طلاء، آج کی دنیا کے خدا
دل میں رکھتے ہو اگر عیش و سکوں کی خواہش
پہلے زردار بنو
خود سے کرتا ہوں سوال
کیا میں زردار بنوں؟
اس پہ کہتا ہے ضمیر
یہ بتاؤ کہ حصول زر سے
کتنے افراد کی تقدیر بدل ڈالو گے
کتنے جسموں کو مسل ڈالو گے
کتنی روحوں کو کچل ڈالو گے
بھوک کے مارے ہوئے لوگوں کا انبوہ کثیر
کیا یہ رہے گا یونہی؟ کیا بھلا دو گے اسے؟
میں یہ کہتا ہوں بھلا ان کو بھلادوں کیوں کر

یہ مرے بھائی ہیں، ماں باپ مرے اور احباب
میں انھیں میں تو پلا اور بڑھا
ٹوٹ کر ان سے بھلا اور میں جاؤں گا کہاں
کیسے سمجھاؤں انھیں!

کہ یہی ہے وہ شعور
جو کہ افکار پراگندہ کو دے کر اک ربط
ان کو دیتا ہے زباں
کیسے بتلاؤں انھیں!

کہ یہی ہے وہ شعور
مری تخئیل کا اور فن کا سہارا لے کر
میرے گیتوں، مرے نغموں میں جو ڈھل جاتا ہے
کاش وہ جان سکیں
میرے نغمے، مرے نوحے مرے گیت
ہیں فقط جہد بقا
اس کے سوا کچھ بھی نہیں

(مارچ ۱۹۶۰ء)

# فن کار

میں کوئی صاحبقراں نہیں ہوں
میں ایک سائل ہوں روشنی کا
مجھے تو سورج کی جستجو ہے
وہ ایک سورج جو ضوفشاں ہے
مصاف کون و زماں میں کب سے
وہ ایک سورج ضیاء سے جس کی
دمک رہے ہیں نجومِ شب تک

---

میں ایک فن کار اک ندا ہوں
جو شب زدوں کو جھنجھوڑتی ہے

# ترتیب


| | | |
|---|---|---|
| ۱- حقیقت آشنا شاعر | ڈاکٹر محمد علی صدیقی | ۷ |
| ۲- کیکٹس کے پھول | | ۱۵ |
| ۳- جلتے دن کا سپنا | | ۲۰ |
| ۴- دوستو | | ۲۱ |
| ۵- چاندنی | | ۲۳ |
| ۶- انتظار | | ۲۶ |
| ۷- دعوت | | ۲۹ |
| ۸- خواب اثر | | ۳۱ |
| ۹- تخت یا تختہ | | ۳۲ |
| ۱۰- سوال | | ۳۴ |
| ۱۱- شگون | | ۳۷ |
| ۱۲- [illegible] | | ۳۹ |
| ۱۳- تحریک | | ۴۱ |
| ۱۴- فن کار | | ۴۸ |
| ۱۵- جرم و سزا | | ۵۱ |
| ۱۶- دیگر دوہا | | ۵۴ |

ستمگروں کی سماعتوں پر
جو برق بن بن کے کوندتی ہے
جو خامشی کے مہیب صحرا
میں روشنی کی نقیب بن کر
ستم زدوں کو جگا رہی ہے
ستمگروں کو ڈرا رہی ہے
اجل کا نغمہ سنا رہی ہے

---

میں ایک رہرو ہوں ساتھ جس کے
وہ لوگ سارے ہیں جن کا صدیوں
نظامِ زر نے لہو پیا ہے
وہ لوگ جو اب رواں دواں ہیں
دیارِ حسنِ سحر کی جانب
عروجِ نوعِ بشر کی جانب

---

میں ایک پیرو ہوں اہلِ دل کا
جنھوں نے محبس میں ظلم سہ کر

جنھوں نے سولی پہ جان دے کر
جنھوں نے زنداں میں زہر پی کر
ہماری خاطر ہماری راہوں
سے چند کانٹے ہٹا دیے ہیں
وفا کے گلشن سجا دیے ہیں

---

میں اک نوا ہوں جو قصر و ایواں
کے بند دروازے کھٹکھٹا کر
اب ان کی بنیاد ڈھا رہی ہے
اور ایسی راہیں سجھا رہی ہے
کہ جن پہ چل کر تمام انساں
ہزاروں صدیوں کے بار غم کو
عدم کے غاروں میں پھینک آئیں

---

میں کوئی صاحبقراں نہیں ہوں
میں ایک سائل ہوں روشنی کا

(اپریل ۶۳ء)

# جرم و سزا

(آٹھ جنوری کے شُہداء کی یاد میں)

زندانیِ لاہور ہو، سقراط کہ عیسیٰ
یا شہرِ کراچی کے جوانمرگ مسیحا
اس قتل گہہ شوق میں آتے نہیں ڈرتے
سچ بات سردار سناتے نہیں ڈرتے
ہم علم کے طالب ہیں صداقت کے طلبگار
ہم حق کے لیے سر بھی کٹاتے نہیں ڈرتے
بے کار ہیں فطرت کے نشانات پہ پہرے
لگتے ہی نہیں تازہ خیالات پہ پہرے
انفاس کی شمعیں نہ بجھی ہیں نہ بجھیں گی
ہر حال میں جلتی ہیں یہ جلتی ہی رہیں گی

---

تم جسم میں ہو قوم کے ناسور کی صورت
اور ہم سے تقاضہ کہ مسیحا تمھیں سمجھیں
کرتے ہو اگر بات تو طاقت کی زباں میں
اور ہم سے یہ کہتے ہو کہ اپنا تمھیں سمجھیں
اغیار کی بندوق ہے کندھے پہ تمھارے
اور قوم کے معصوم سپوت اس کا نشانہ
آزاد تمھارے ہیں بدن، ذہن مقیّد
اور کرتے ہو تم رہبریِ قوم کا دعویٰ
تم پلتے چلے آئے ہو انساں کے لہو پر
اس خصلتِ ناپاک پہ نازاں ہو ابھی تک
آیا لبِ مظلوم پہ جب بھی کبھی نالہ
تم نے وہیں شمشیر فروشوں کو پکا،
تم نے تو یہ چاہا تھا نہ ابھرے کوئی آواز
رہرو نہ کوئی راہ طلب پر کبھی آئے
اور جینے کا حق تم سے کبھی کوئی نہ مانگے
پر آج بھی اک قافلۂ اہلِ تمنّا
منزل کی طرف ہے اسی دم خم سے روانہ
جو تیرگی و جہل سے ہے برسرِ پیکار

جو وقت کی مانند کبھی رک نہ سکے گا
شاید تمھیں معلوم نہیں جبر و ستم سے
کچھ اور بھڑک جاتے ہیں احساس کے شعلے

---

زندان و عدالت بھی ہیں قبضے میں تمھارے
فوج کی بندوق ہے ہاتھوں میں تمھارے
فولاد صفت دل بھی ہیں سینوں میں تمھارے
پھر ڈرتے ہو کیوں تذکرہ اہل وفا سے
کیوں اتنے حراساں ہو صداقت کی صدا سے
خائف تو نہیں اپنے گناہوں کی سزا سے

---

(جنوری ۱۹۶۳ء)

# دکھ دور ہوا

جس صحرا میں، میں پیاسا تھا
وہ صحرا خود بھی پیاسا تھا
جہاں ڈھونڈو بھی تو
دور تلک
نہ کوئی بہتا چشمہ تھا
نہ کوئی ٹھنڈا سایا تھا
ہر بادل دھول کا بادل تھا
ہر دریا ریت کا دریا تھا
جہاں گرم ہوا کا ہر جھونکا
بس لوں کا ایک تھپیڑا تھا
سب سانسیں جلتی سانسیں تھیں
ہر آنسو اک انگارہ تھا۔

ہر سسکی میں اک شعلہ تھا
ہر رستہ گھور اندھیرا تھا
یہ صحرا میری ذات میں تھا
لیکن میں جب تک تنہا تھا

تنہائی کا دکھ جب دور ہوا
اور ہم تم سارے ساتھ ہوئے
مری ذات میں سَو سَو پھول کھلے
ہر رستہ کرن کرن جاگا
ہر آہٹ سے اک تال اٹھی
سسکی کی جگہ نغموں نے لی
دریا انگڑائی لے کے چلا
بادل نے پھواریں برسائیں
سایوں میں ٹھنڈک رچنے لگی
چشموں کے سوتے جاگ اٹھے
گو صحرا اب بھی صحرا ہے
اور ہم تم اب بھی پیاسے ہیں
پر آس کے رستے روشن ہیں
اور ہاتھ میں ہاتھ تمہارا ہے

# شب خون

پھول کمھلا گئے چاند گہنا گیا
پھر اندھیرا افق تا افق چھا گیا
سرخ پھولوں کی رنگت ہوئی جامنی
پھر لگی گونجنے دکھ بھری راگنی
مارے ڈر کے کلی زرد سی پڑ گئی
زندگی خوف سے سرد سی پڑ گئی
کوہساروں سے لاوا پڑا ہے اُبل
بجھ گئے پھر امیدوں کے روشن کنول

پھر نگاہوں سے گم ہوگئی روشنی
حوصلوں پر بھی چھانے لگی مردنی
آگیا پھر خزاؤں کی زد میں چمن
کھوگئی پھر اندھیروں میں ہر اک کرن
پھر نشیمن کے تنکے بکھرنے لگے
جام آنکھوں کے اشکوں سے بھرنے لگے
ہاتھ طاغوت کے پھر سے بڑھنے لگے
اہل حق پھر سے سولی پہ چڑھنے لگے
شب کی تیرہ قبا چھاگئی راہ پر
کارواں زندگی کا ہوا منتشر
آج اہلِ جُنوں کا جگر خون ہے
ہاں یہ رجعت پرستی کا شبخون ہے

# امر راکھ

رات اور دن کی بھٹی میں
ہم تم جیسے لوگ ہی جلتے رہتے ہیں
مگر بہت سے ایسے ہیں
بے جانے بوجھے، بے خبری میں
بس یوں ہی مٹتے جاتے ہیں۔
میری بس یہ خواہش ہے۔
ہم لوگ، جو ایندھن بنتے ہیں۔
جلتے ہیں۔ جلیں
اور راکھ بنیں۔

| | |
|---|---|
| ۱۷- شب خون | ۵۶ |
| ۱۸- ام راکہ | ۵۸ |
| ۱۹- آزادی | ۶۱ |
| ۲۰- لمحہ موجود | ۶۳ |
| ۲۱- التجا | ۶۶ |
| ۲۲- اسم اعظم | ۶۸ |
| ۲۳- تیرگی کا کفن | ۷۲ |
| ۲۴- تفہیم | ۷۵ |
| ۲۵- زخمی خواب | ۷۶ |
| ۲۶- تعبیر | ۷۷ |
| ۲۷- محنت | ۷۸ |
| ۲۸- محنت کش | ۷۹ |
| ۲۹- زمرد | ۸۲ |
| ۳۰- سوؤں کیسے | ۸۳ |
| ۳۱- احوال وطن | ۸۴ |
| ۳۲- بازی گر | ۹۱ |
| ۳۳- دشمن میرے خواب کے | ۹۳ |
| ۳۴- بجرا | ۹۵ |
| ۳۵- عرض حال | ۹۶ |
| ۳۶- رفیقوں کی رہائی پر | ۱۰۱ |
| ۳۷- سکوت | ۱۰۲ |
| ۳۸- تیرے خوں کی قسم | ۱۰۳ |
| ۳۹- شہید کی آواز | ۱۰۵ |
| ۴۰- نذر لوممبا | ۱۰۸ |
| ۴۱- پنگھٹ | ۱۱۵ |
| ۴۲- گیت | ۱۱۷ |

راکھ ایسی کہ ہوا
اس کو اڑا کر لے جائے
جب کسی بن کی طرف
بہر اشجار یہ سامانِ نمو بن جائے
کوئی درماندہ مسافر
جو ادھر آ نکلے
دو گھڑی، چھاؤں میں دم تازہ کرے
پھر کسی تازہ سفر پر نکلے
راکھ ایسی کہ اگر
کوئی ہوا کا جھونکا
کھیت کی سمت اڑا دے اس کو
بیج کو ایک نئی قوتِ تخلیق ملے
فصل لہرائے
تو آنکھوں کو تراوٹ پہنچے
راکھ ایسی کہ اگر
آدمی اس کو بدن پر مل لے
مسکراتا ہوا
ہر ایک کڑی رت جھیلے
راکھ ایسی کہ اگر

کوئی جیالا گھائل
ایک چٹکی بھی اگر
گھاؤ پر اپنے رکھے
کم سے کم بہتا لہو رک جائے۔
میری خواہش ہے کہ
ہم لوگ جلیں۔ راکھ بنیں
اور امر ہو جائیں۔

# آزادی

اے عروسِ بہارِ آزادی
تو نہیں ہے تو زندگی کیسی
نغمہ ہائے طیورِ صبح کہاں
غنچہ و گل میں تازگی کیسی
ذکرِ مینا و جام و مئے کیسا
بزمِ رنداں میں پھر خوشی کیسی
رنگ آہنگ نور کچھ بھی نہیں
موت کا سا سکوت طاری ہے
آج پھر تیرے دلفگاروں کے
دل کے زخموں سے خون جاری ہے
مشغلہ پھر وفا شعاروں کا
سینہ کوبی ہے آہ وزاری ہے

جرم ہے آج گفتگو تیری
ذکر تیرا ہے لائق تعزیر
بے ضمیری کی قدر و قیمت ہے
کنج زنداں وفا کی ہے تقدیر
عشق ہے وجہِ ننگ و رسوائی
ہاں مگر بوالہوس کی ہے توقیر
تیرے گیسو اگر سنور جاتے
ہم بھی چاک جگر کو سی لیتے
دو گھڑی تو جو مسکرا لیتی
ہم بھی دو دن خوشی سے جی لیتے
قید کیا چیز ہے تری خاطر
زہرِ قاتل بھی ہنس کے پی لیتے
ہم تو ہر حال میں سدا تجھ کو
دل کی گہرائیوں سے چاہیں گے
کنج زنداں سے تیری محفل تک
خون دل سے دیئے جلائیں گے
اور اسی روشنی میں پھر اک دن
تیری محفل میں تجھ کو لائیں گے

# لمحۂ موجود

میں پلکوں پر دیئے سجائے
بھلے سمے کی آشاؤں کے
اندھیارے رستے پر چل کر
اب اس موڑ پہ آ پہنچا ہوں
جس کے ایک طرف کھائی ہے
دوسری جانب
لوہے کی دیوار کھڑی ہے
کھائی کنارے

ایک مہاجن
سونے کی زنجیریں تھامے
ڈول رہا ہے
لوہے کی دیوار کے پیچھے
بھلے سموں کا اُجیارا ہے
میرے پیچھے
مجھ ہی جیسے
لوگوں کا انبوہ کھڑا ہے
دیکھ رہا ہے
تیز ہواؤں کے جھونکوں سے
سونے کی زنجیر کی کڑیاں ٹوٹ رہی ہیں
اور مہاجن کے سواگت کو
بھوکی کھائی
اپنے جبڑے کھول رہی ہے

مجھ ہی جیسے لوگوں کا
انبوہ کھڑا یہ دیکھ رہا ہے
لوہے کی دیوار کی کوئی
نیو نہیں ہے

من ہی من میں سوچ رہا ہے
سب مل کر اک دھکا دیں
تو بھی سمے کا رستہ روکے
جو اونچی دیوار کھڑی ہے
ڈھے جائے گی
لیکن میں یہ سوچ رہا ہوں
سوچ عمل میں کب ڈھلتی ہے؟

# التجا

کون جانے خیال میں تیرے
میں نے کتنے بتوں کو پوجا ہے
کون جانے اندھیری راتوں میں
کتنی راہوں پہ تجھ کو ڈھونڈا ہے
کون جانے فراق میں تیرے
کتنا آنکھوں نے خوں بہایا ہے
کون جانے کہ، کس طرح ہنس کر
میں نے دنیا کے غم اٹھائے ہیں

کون جانے کہ غم زدہ دل سے
کیسے الفت کے گیت گائے ہیں
کون جانے طلب کے صحرا میں
میں نے کتنے سراب دیکھے ہیں
کون جانے کہ جاگتے میں سدا
کتنے پُرہول خواب دیکھے ہیں
اے نگارِ سحر جبیب نظر
میری آنکھوں کی روشنی تو ہے
تو ہے تسکینِ روح کا ساماں
میرا مقصودِ زندگی تو ہے
بن ترے ایک پل قرار نہیں
آ بھی جا تاب انتظار نہیں

(جولائی ۱۹۵۹ء)

# اسم اعظم

میرے چاروں طرف
سربریدہ بدن
اپنے سفاک قاتل سے ناآشنا
سمت منزل کی جن کو نہیں ہے خبر
کوچہ و شہر میں، کھیت کھلیان میں
ہر قدم اک نیا زخم کھاتے ہوئے
حوصلے قاتلوں کے بڑھاتے ہوئے
بیچ در بیچ ہیں راستوں پر رواں

# حقیقت آشنا شاعر

واحد بشیر کا اولین شعری مجموعہ کافی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ وہ 45-40 سال سے ٹریڈ یونین تحریک کے متعہد کارکن اور قائد کی حیثیت سے معروف ہیں۔ تحریکی کام میں انتہائی بااصول آئیڈیالاگ (Idealogue) کی حیثیت سے ان کے شعری نظریات بہت واضح طور پر ترقی پسند تحریک سے متاثر ہیں بلکہ اس تحریک کے لیے نظریاتی ایندھن فراہم کرتے رہے ہیں۔ وہ پاکستان میں ٹریڈ یونین ازم کے نشیب و فراز کی طویل صبر آزما جدوجہد میں اپنی قابل داد Integrity کی وجہ سے بہت عزت و احترام سے دیکھے جاتے ہیں۔

جب مجھے واحد بشیر کے اولین مجموعۂ کلام " کیکٹس کے پھول " پر تحریر کرنے کی دعوت دی گئی تو میں نے اسے اپنے لیے ایک اعزاز سمجھا، شاید اس لیے کہ واحد بشیر اپنے کلام کے بارے میں صرف ان ہی اشخاص کی تحریر کو خوش آمدید کہہ سکتے ہیں جن کے بارے میں وہ خود کسی الجھن میں گرفتار نہ ہو سکیں۔ واحد بشیر کے شعری مجموعے کی ہر ایک نظم کی ایک ایک سطر جس بے ریا اور شفاف ذہنی Landscape کی آئینہ دار ہے وہ فی زمانہ ناپید

اک مدّت سے ہیں
جانے کب تک رہیں
میرے چاروں طرف
سربُریدہ بدن
دیکھنے میں تو وہ سربُریدہ نہیں
جبر و تعزیر نے
کاٹ لی ہے زباں
اور بھلے وقت کا
راستہ دیکھتے
آنکھیں پتھرا گئیں
کان حرفِ تسلّی کو ترسا کیے
اور بہرے ہوئے
بار حالات سے ہیں نگوں گردنیں
یوں بدن پر اگر سر ہوئے بھی تو کیا!
میرے چاروں طرف
سربُریدہ بدن
سربُریدہ سہی سرد لاشیں نہیں
زندگی سے انھیں بھی بہت پیار ہے
یہ مشینیں نہیں یہ فرشتے نہیں

جو کہ عاری ہوں احساس و ادراک سے
بس انھیں خوف کا اور اندیشوں کا
اک طلسمِ خیالی ہے جکڑے ہوئے
اس طلسمِ خیالی کا اک توڑ ہے
اسمِ اعظم پڑھو! اسمِ اعظم پڑھو
سربریدہ تنوں میں رواں
اے لہو!
گرم ہو۔ گرم ہو
تجھ سے ہر ایک تخلیق کی زندگی
تجھ سے ہے نظمِ عالم کی تابندگی
اے لہو گرم ہو!
تیز رفتار ہو!
جبر کی برف اب تو پگھلنے کو ہے
ایک سورج نیا اب نکلنے کو ہے
زندگی اک نیا رخ بدلنے کو ہے
اے لہو گرم ہو!
تلخ گفتار ہو!
برملا اپنے قاتل کا اب نام لے
اے لہو!

اپنا حق چھین لے
کوچہ و شہر سب تیرے ہیں تیرے ہیں
کھیت کھلیان سب تیرے ہیں تیرے ہیں
ملک یہ تیرا ہے یہ زمیں تیری ہے
اور غاصب کا حق
اس زمیں پر فقط
قبر ہے! قبر ہے!

(اکتوبر ۱۹۶۸ء)

# تیرگی کا کفن

کتنا تاریک ہے مرا ماحول
کالی صدیوں کا جس پہ سایہ ہے

روشنی کی تلاش کو اک جرم
اس نے ہر دور میں بتایا ہے

مجرموں کی مگر کمی نہ رہی
اس نے لاکھوں کو گو مٹایا ہے

جو مٹا، مٹ کے شعلہ بار ہوا
ایک تھا ایک سے ہزار ہوا

جوہرِ تیغِ آب دار ہوا
سرفروشوں میں ذی وقار ہوا

ایک سے اک چراغ جلتا رہا
تیرگی کا شباب ڈھلتا رہا

لاکھ ڈھلنے پہ بھی یہ تاریکی
پانو لٹکائے قبر میں بیٹھی

ننھی کرنوں پہ یوں جھپٹتی ہے
جیسے مکھی پہ جال کی مکڑی

میں کہ ہوں اپنے عصر کا ملزم
روشنی کی تلاش کا مجرم

تجربہ ، پیش رو جو ہیں ان کا
ہے مرا لازوال سرمایہ

اپنی اس لازوال دولت سے
اک دیا میں نے بھی جلایا ہے

اب مگر میں نہیں رہا تنہا
اور مجھ سے ہزار دیوانے

اپنے اپنے دیوں کے تیشوں سے
وار تاریکیوں پہ کرتے ہیں

ہم یہ سارے دیے ملالیں گے
ایک شعلہ نیا بنالیں گے

ایسا شعلہ کہ جس کی تابانی
تیرگی کے لیے کفن بن جائے

(فروری ۱۹۶۵ء)

# تفہیم

دیکھو چاند
برا مت مانو
تم صبحوں کے بھید نہ سمجھو
میں راتوں کے رمز نہ جانوں
تم ٹھنڈے سائے میں بیٹھے
میٹھے سپنے دیکھ رہے ہو
میں مرجھائے پھول سمیٹے
کڑی دھوپ میں پگھل رہا ہوں
اپنا ساتھ نبھے گا کیسے؟

# زخمی خواب

شکستہ لمحے، شکستہ جذبے
سمیٹ کر تم
جو خواب تعمیر کر رہے تھے
وہ خواب نیزوں سے چھد گئے ہیں
مگر یہ دیوانگی ہے کیسی!
تمھارے ہونٹوں سے قہقہے کیوں ابل رہے ہیں
مری سماعت میں زہر بن کر اتر رہے ہیں

# تعبیر

خواب دیکھتی آنکھیں
دیکھو کتنی حیراں ہیں
دور کانپتا شعلہ
جب بھی پاس آتا ہے
سانس جل سا جاتا ہے

# محنت

ہمیں خبر ہے کہ
دلبری کے تمام رنگوں میں
کس کا پرتو جھلک رہا ہے
تمام رونق
تمام شوکت
تمام لذّت
اسی کے دم سے
اسی سے ہم ہیں
یہی ہماری شناخت ٹھہری
یہی ہماری متاع ٹھہری
مگر یہ سوچو
کہ اس کا ثمرہ
ہمارے دامن میں کیوں نہ آیا؟

(جون ۱۹۷۹ء)

نہیں تو خال خال ہی نظر آتی ہے۔ یہ کلام ایک ایسے زمانے میں شائع ہورہا ہے جسے زمانۂ سابق کے بڑے بڑے متعہد (Committed) ادیب بھی اپنے نظریات کے حوالے سے دل شکستہ اور پژمردہ نظر آتے ہیں۔ مشرقی یورپ میں اس صدی کے آخری عشرے میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں نے ان حضرات کو بلاشک و شبہ جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے جو سوشلزم کے مبلغ سے زیادہ سوشلسٹ دنیا کی جغرافیائی وسعت سے متاثر تھے اور وہ حضرات کسی فلسفے کے حکومتی ڈھانچے یا عمل (Practice) میں ناکامی کو اس فلسفے یا تھیوری (Theory) کی ناکامی قرار دینا چاہتے ہیں۔ حالانکہ اتنے متعدد مذہبی سماجوں میں مذہب کی پسپائی کو مذہب کی پسائی گردانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ سیاسی فلسفوں کے Implementation میں ناکامی کی ذمہ داری سیاسی فلسفے کے بجائے حکومتی ڈھانچے اور عمال پر ڈالنی چاہیئے تھی لیکن دوہرے معیارات نقد و نظر کے اس پرآشوب دور میں یہ روش زیادہ تعجب خیز بھی نہیں۔

واحد بشیر کا فلسفۂ زندگی اور شعری بوطیقہ ایک مستقل بالذات آدرش کے ساتھ لازم و ملزوم ہے اور شاید اسی لیے قارئین ادب کے لیے واحد بشیر کی شاعری میں منظم فلسفۂ زندگی پر یقین رکھنے والے فرد کے قدرتی ردعمل کی کارفرمائی دیکھنے میں چنداں تعجب نہ ہونا چاہیئے۔

# محنت کش

میں پانی ہوں
جیون کی دھارا ہے مجھ سے
میری فطرت بہنا ہے
میرا کام
داغ اور دھبے دھونا ہے
دھرتی کی پیاس بجھانا ہے
اس کی کوکھ سے پھوٹنے والی
فصلوں کو پروان چڑھانا ہے

جیون دیپ کی
بڑھتی لَو کو
اور بڑھانا ہے
اور تم مجھ کو
اونچ نیچ کے
ذات پات کے
رنگ برنگے
جاروں میں بھر کر
چار طرف دیوار اٹھا کر
اس دھوکے میں بیٹھے ہو کہ
میں نے تمھارے سانچوں کو اپنایا ہے
میری فطرت بدل گئی ہے
مگر تمھارے دل کے اندر
چور ہی ہے
ہر دم تم کو اک دھڑکا سا رہتا ہے
جاروں کے بندی خانے سے باہر
اور بہت سے روپ میں میرے
بہنا میری فطرت ہے
تم ڈرتے ہو

اگر کسی دن
چشمے، نالے، ندیاں مل کر
دریا کی طغیانی بن جائیں
اور بہالے جائیں
وہ سب کچھ جو کہ تمھیں
انسانوں سے زیادہ پیارا ہے
مجھے یقیں ہے اک دن ایسا ہو کے رہے گا۔
میں پانی ہوں
جیون کی دھارا ہے مجھ سے
بہنا میری فطرت ہے

# زمرّد

زمرّد زرد ہوتے ہیں
یہ کانوں میں نہیں پلتے
کہیں باہر سے آتے ہیں
سرنگوں کی گھٹن میں
چٹانیں کاٹتے ہیں
اور ان کے عارضِ گُل گوں
چمکتی نیل گوں آنکھوں پہ
زردی کھنڈ جاتی ہے
زمرّد زرد ہوتے ہیں

# سوؤں کیسے

میں خواب نگر کا باسی ہوں
مری پلکوں پر ہیں خواب سجے
وہ خواب ہیں سچی خوشیوں کے
جو سب کے ہیں اور سانجھے ہیں۔
لیکن ان پر ہر جانب سے
کیا جانے کیوں یلغاریں ہیں!
یہ خواب لہو سے بوجھل ہیں
اس خوں سے، جو گلیوں سڑکوں پر
دن رات بہایا جاتا ہے
مری آنکھوں، ذہن اور چہرے پر
ہر لمحہ گرایا جاتا ہے۔
مرے خواب لہو سے بوجھل ہیں
میں آنکھیں بند کروں کیسے؟
بولو! میں بھلا سوؤں کیسے؟

# احوالِ وطن

آرہی تھی کہیں سے یہ آواز
زندگی کا بدل گیا انداز

بادشاہی جو ایک لعنت تھی
اپنے انجام کو پہنچ ہی گئی

جبرِ افرنگ سے نجات ملی
ملک کو اک نئی حیات ملی

دورِ ظلمت کا اختتام ہوا
اک نئے ملک کا قیام ہوا

اب اجیرن نہ زندگی ہوگی
جھونپڑوں میں بھی روشنی ہوگی

کوئی بھوکا نہ رہ سکے گا اب
کوئی ننگا نہ رہ سکے گا اب

اب محبت برادری ہوگی
زندگی میں ہر اک خوشی ہوگی

اہلِ زر کی نہ خواجگی ہوگی
اب حکومت عوام کی ہوگی

سبز پرچم ہوا میں لہراؤ
آج مستی میں جھوم کر گاؤ

آرہی تھی کہیں سے یہ آواز
زندگی کا بدل گیا انداز

جشنِ آزادیِ وطن کا سماں
مجھ سے ہرگز نہ ہو سکے گا بیاں

دل ہر اک نفرتوں کا مخزن تھا
آدمی آدمی کا دشمن تھا

قافلے راستے میں لٹتے تھے
رہنما بس بیان دیتے تھے

یاد کوئی گرو کو کرتا تھا
کوئی اللہ کہہ کے مرتا تھا

کوئی ہے رام کہہ کے مرتا تھا
ہر خدا آہیں سرد بھرتا تھا

لگ رہے تھے جنون میں نعرے
تھے اچھلتے لہو کے فوارے

سر کہیں دھڑ کہیں کہیں بانہیں
میں نے گھبرا کے میچ لی آنکھیں

جشنِ آزادی وطن کا سماں
مجھ سے ہرگز نہ ہوسکے گا بیاں

جس جگہ روشنی پہ پہرے ہیں
زرد برگِ خزاں سے چہرے ہیں

جس جگہ زندگی بلکتی ہے
بھوک کی آگ ہی دہکتی ہے

جنسِ صدق و وفا گراں ہے جہاں
لوگ کہتے ہیں جس کو پاکستاں

جس کے دیہات مفلسی میں اسیر
جس کے قصبات درد کی تصویر

صبح بھی روسیاہ ہے جس جا
مفلسی اک گناہ ہے جس جا

ہر زمیندار ہے شہِ بے تاج
خونِ ہاری سے لے رہا ہے خراج

کارخانے عظیم ہوتے ہیں
اور مزدور بھوکے سوتے ہیں

اجرتوں میں کمی ضروری ہے
آجروں کی خوشی ضروری ہے

یہ اجیروں کی بستیاں توبہ
ابنِ آدم کی پستیاں توبہ

جہل افلاس فاقہ مستی ہے
زیست نایاب موت سستی ہے

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

خودغرض رہبرانِ عالی مقام
قوم کو کر رہے ہیں جو نیلام

کوئی برطانیہ کا پٹھو ہے
اور ڈالر پہ کوئی لٹو ہے

ہر زباں پر قدیم نعرے ہیں
ہم تمھارے ہیں ہم تمھارے ہیں

مغربی بودوباش ہے جن کی
بس تجارت معاش ہے جن کی

لاکھ دس لاکھ ہی کماتے ہیں
روکھی سوکھی اسی میں کھاتے ہیں

کوٹھیوں میں غریب رہتے ہیں
قوم کے غم میں وہسکی پیتے ہیں

اور بیچارے بدنصیب عوام
ہیں گرفتارِ گردشِ ایام

گھونٹ اپنے لہو کے پیتے ہیں
موت کی آرزو میں جیتے ہیں

لیکن اک روز ایسا آئے گا
ضبط کا بند ٹوٹ جائے گا

جس جگہ روشنی پہ پہرے ہیں
زرد برگ خزاں سے چہرے ہیں

آرہی تھی کہیں سے یہ آواز
زندگی کا بدل گیا انداز

(۱۹ ستمبر ۱۹۵۸ء)

# بازی گر

انجانے بے سمت سفر پر تم نکلے ہو
الٹے پیروں چل کر کیا کرتب دکھلاتے ہو
کس کا دل بہلاتے ہو
کس کو دھوکا دیتے ہو
کیا تم نے اس ہفتے کی خبر سُنی ہے؟
دو اوپر اسّی برس کے
اس برمن، بازی گر کی
جو اونچائی پر

دوش ہوا پر
رسہ تان کر
اک کرسی پر بیٹھا کرتا تھا
یہ اس کا اپنا کرتب تھا
اس کرتب میں وہ ماہر تھا
ساری عمر وہ اس کرتب سے
دولت اور شہرت میں کھیلا
لیکن آخر پچھلے ہفتے
اونچائی پر تنے رسے سے
وہ سر کے بھل نیچے آیا
اپنا حشر بھی دیکھ نہ پایا
الٹے پیروں چل کر تم کرتب تو دکھلاتے ہو
جانے کیا ہو حشر تمھارا

# دشمن میرے خواب کے

کچھ جانے پہچانے چہرے
سنگینیں بندوقیں تانے
رات مرے تکیے کے نیچے چھپے ہوئے تھے
خوف سے تھر تھر کانپ رہے تھے
ان میں سے اک مونچھوں والا
یوں گویا تھا
چوکس رہنا!
اس تکیے پر سونے والا
خوابوں کا متوالا ہے

خواب بھی کیسے!
امن و سکوں کے
ہنستی گاتی شام و سحر کے
اور ہم جیسے
دام کی خاطر خوں کی ہولی کھیلنے والے
تاک میں رہنا
دن بھر کی محنت سے ماندہ
نیند سے ہارے اور سو جائے
شبخوں مارو!
اس کے سارے خواب بکھیرو
ذہن کو اس کے چھلنی کر دو۔
بڑکیں سن کر
میں نے سوچا
ان "ویروں" کی شکل تو دیکھوں
تکیہ الٹا
اس کے نیچے
گئے دنوں کی دھول جمی تھی
جس پر کھٹمل رینگ رہے تھے

# بکرا

لمبی داڑھی
پٹھے پر زرّیں دو شالہ
گلے میں گھنگرو
پانو میں پائل
سینگیں اس کی سجی سجائی
بینڈ کی دھن پر اکڑ اکڑ کر
سب دستوں کے آگے چلتا
شاہ نشیں کے سامنے پہنچا
سر کو جھکا کر
ہر افسر کو
سات سلامی دے کر اٹھا
اور مجمع کو تن کر دیکھا
جیسے کہتا ہو لوگوں سے
میں افسر ہوں

(جولائی ۱۹۷۶ء)

# عرضِ حال

آج کیوں منقار زیرِ پر ہیں مرغانِ چمن
آج کیوں ہے مجلسِ ماتم یہاں ہر انجمن
رند سارے میکدے میں آج کیوں خاموش ہیں
آج کیوں آتش بجاں ہے شاعرِ شیریں سخن

گر اجازت ہو تو عرضِ حال کی جرات کروں
ناز کیئ خاطرِ حاکم سے گھبراتا ہوں میں
گو بیانِ غم کا حاصل جز پشیمانی نہیں
یونہی کہنہ داستانیں آج دہراتا ہوں میں

آج بھی تو عارفوں کی لب کشائی جرم ہے
آج بھی منصور کھینچے جا رہے ہیں دار پر
ہوتی ہیں شرعِ متیں کی اب بھی تاویلیں غلط
بے ضمیری کا ہے طرّہ شیخ کی دستار پر

خونِ مفلس آج بھی سوداگروں کی ہے شراب
آج تک ہے زندگی پر موت ہی سایہ فگن
زینۂ بامِ ترقی ہے ابھی مکر و دغا
ہے ابھی اہلِ صداقت کے لیے دار و رسن

عصمتیں بکتی ہیں اب بھی یاں کھلے بازار میں
بے دھڑک لٹتی ہے اب بھی عارض و لب کی بہار
بیٹیاں بکتی ہیں اب بھی چند سکوں کے لیے
دیکھتی رہتی ہے سب کچھ رحمتِ پروردگار

شمر اب بھی پھر رہے ہیں دندناتے چار سو
اب بھی آہِ بے کساں کی کچھ نہیں داد و شنید
خون بہتا ہے ابھی تک گردنِ مظلوم سے
وقفِ شغلِ کُشت و خوں ہے اب بھی اولادِ یزید

زینبوں کے سر سے اب تک کھینچ رہی ہیں چادریں
اور گلوں پر اکبروں کے ہے رواں تیغ ستم
آج بھی تو عابدوں کے پاؤں میں ہیں بیڑیاں
اور سکینائیں ابھی تک ہیں اسیر بند غم

خون دہقاں آج بھی ہر دانۂ گندم میں ہے
جبر کی چکی میں پستا آج بھی مزدور ہے
عرش کی رفعت سے بیٹھا دیکھتا رہتا ہے یہ
قادر مطلق بھی جیسے بندہ مجبور ہے

اب بھی طرز زندگی میں ہے وہی کہنہ تضاد
چور ہے کوئی نشے میں اور کوئی تشنہ دہن
آج بھی سوتا ہے کوئی بستر کمخواب پر
جسم چاہے ڈھانپنا کوئی تو پاتا ہے کفن

روز شب کو ہوٹلوں میں کوئی کھاتا ہے ڈنر
اور کسی گھر میں غریبی سے نہیں جلتا چراغ
ڈالتا رہتا ہے صوفوں پر کوئی مئے کے نشاں
سر جھکائے دیکھتا رہتا ہے کوئی دل کے داغ